# حکمتِ قرآنی کی اساسات

## سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم ۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ
يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا
الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ
اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ
بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫
وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ يٰبُنَيَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ
خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ
عَلٰى مَا اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ
لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ
فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ
الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾﴾ (لقمٰن) ...... صدق اللّٰہ العظیم



مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کی تشریح اِن صفحات میں قسط وار شائع ہو رہی ہے اس کا پہلا درس سورۃ العصر پر اور دوسرا آیۃ البرّ پر مشتمل تھا۔ اب ہم اللہ کے نام سے اس سلسلے کے تیسرے درس کا آغاز کر رہے ہیں جو سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے۔ سورۂ لقمان مصحف میں اکیسویں پارے میں شامل ہے اور اس کا دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ تو آئیے اس کا ایک رواں ترجمہ سمجھ لیں، تاکہ رکوع کے مضامین بیک وقت ہماری نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔

''اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا فرمائی کہ شکر کر اللہ کا، اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کو، اور جو کوئی کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرتا ہے تو اللہ غنی ہے (بے نیاز ہے، اور وہ آپ ہی اپنی ذات میں محمود ہے) ستودہ صفات ہے۔ اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔ اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے اُس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر، اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں، کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو اُن کا کہنا مت مان اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر، اور پیروی کر اُس کے راستے کی جس نے اپنا رُخ میری طرف کر لیا ہو۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے اور میں تمہیں بتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ اے میرے بچے! خواہ وہ (یعنی نیکی یا بدی) رائی کے دانے کے ہم وزن ہو، اور خواہ وہ کسی چٹان میں ہو، خواہ آسمانوں میں ہو اور خواہ زمین میں ہو، اللہ اسے لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین ہے، بہت باخبر ہے۔ اے میرے بچے! نماز قائم رکھ، نیکی اور بھلائی کا حکم دے، بدی اور برائی سے روک اور پھر صبر کر اُس پر کہ جو تجھ پر بیتے۔ یقیناً یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور اپنی گردن کو ٹیڑھا نہ کر (کج رُخی اختیار نہ کر) لوگوں کے لیے اور زمین میں

اکڑ کر مت چل۔ اللہ کو مغرور لوگ اور شیخی خورے بالکل پسند نہیں۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ' اس لیے کہ تمام آوازوں میں سب سے بڑھ کر ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے''۔

اس ترجمہ سے جو باتیں بادنیٰ تأمل سامنے آتی ہیں اور خاص طور پر اس منتخب نصاب کے اسباق کی ترتیب میں جن بنیادی امور کے پیشِ نظر اسے درسِ سوم کی حیثیت دی گئی ہے' مناسب ہے کہ سب سے پہلے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ہم اِن شاءاللہ اِن آیات کے اصل سبق اور اُن کے لبِّ لباب کا جائزہ لے لیں گے۔

ترجمہ سے آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اِن آیات میں بھی وہی چار باتیں ایک نئے اسلوب اور ترتیب سے بیان ہو رہی ہیں جو اِس سے پہلے سورۃ العصر اور آیۂ بر میں آ چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل ہدایت اور صراطِ مستقیم تو ایک ہی ہے اور اس کے سنگ ہائے میل تو وہی ہیں۔ فرق بقول شاعر صرف یہ ہے کہ ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''۔ گویا مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے ''راہِ ہدایت'' کو واضح کرنا ہی قرآن کا اصل مقصد ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر جگہ وہ بنیادی مضامین نہ صرف ایک نئے رنگ کے ساتھ آئے ہیں' بلکہ موضوع اور سیاق و سباق بھی بدلا ہوا ہے اور بحث بھی نئی ہے۔

## توحید

ذرا جائزہ لیجیے! یہاں ایمانیاتِ ثلاثہ کے ضمن میں ایمان باللہ کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ آیا ہے' مثبت انداز میں بھی اور منفی انداز میں بھی! ایمان باللہ کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرو' اور ایمان باللہ کا منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ لہٰذا التزامِ شکرِ الٰہی اور اجتناب عن الشرک' یہ دونوں چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو گویا ایمان باللہ اور اس کی مطلوبہ کیفیات انسان کو بتمام و کمال حاصل ہو جائیں گی۔

## رسالت

اس کے برعکس ایمان بالرسالت کا ذکر اس پورے رکوع میں آپ کو کہیں نہیں



ملے گا۔ چنانچہ اس میں نہ کسی نبی کا ذکر ہے نہ کسی رسول کا' نہ وحی کا ذکر ہے نہ ملائکہ کا' اسی طرح کسی آسمانی کتاب کا بھی ذکر موجود نہیں ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حکمت کی بنیادی باتیں' حکمتِ قرآنی کے بنیادی اصول ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے بیان ہو رہے ہیں (یعنی حضرت لقمان) جو نہ نبی تھے' نہ رسول تھے' نہ ہی کسی نبی یا رسول کے اُمتی تھے۔ اُن کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ اگر انسان فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی سفر طے کرے گا اور حقیقت کا جویا اور متلاشی ہوگا تو وہ از خود ایمان باللہ تک لازماً پہنچ جائے گا۔ لہٰذا یہاں نبوت و رسالت کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔

## معاد

البتہ ایمان بالآخرۃ' جس کا اصل جوہر اور اصل مآل جزائے اعمال یا مکافاتِ عمل ہے' یعنی یہ کہ انسان کے اعمال و افعال بے نتیجہ نہیں رہیں گے' بلکہ نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ مل کر رہے گا' تو اس کا ذکر یہاں نہایت بلیغ پیرائے میں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کیں اُن میں سے ایک اہم نصیحت یہ ہے کہ:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾﴾

''اے میرے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو' اور پھر خواہ کسی چٹان میں چھپ کر کی گئی ہو' خواہ فضا کی پہنائیوں میں اور خواہ زمین کے پیٹ میں گھس کر (وہ ضائع نہیں ہوگی) اللہ اس کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین' بہت باخبر ہے۔''

یہی اصل میں ایمان بالآخرۃ کا لبِّ لباب ہے کہ ع ''از مکافاتِ عمل غافل مشو!'' اعمال کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لیکن دیکھ لیجیے کہ یہاں یومِ آخر' یوم القیامۃ' جزاء و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ امور وہ ہیں جو صرف نبوت و رسالت کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ گویا یہاں ایمان بالآخرۃ کا

بھی وہی پہلو مذکور ہے جس کا تعلق حکمت و دانائی سے ہے اور جس تک رسائی وحی' نبوت اور رسالت کے بغیر بھی صرف فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں ہو سکتی ہے!

## حکمت کی اساس

واقعہ یہ ہے کہ حکمت کی اصل اساس یہ ہے کہ قلبِ انسانی میں خالق اور ربّ کی جو معرفت ودیعت شدہ لیکن خوابیدہ حالت میں ہے' انسان اس کی جوت کو اپنے قلب و ذہن میں جگا لے۔ گویا فطرت کی صحت اور فکر کی سلامتی کا لازمی نتیجہ ''شکر'' ہے۔ اور سلامتیٔ عقل اور درستیٔ فکر و نظر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگارِ حقیقی کو پہچان لے۔ بالفاظِ دیگر حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ جذبۂ شکر اپنے اصل مالک' آقا' پالن ہار اور پروردگار کی ذات پر مرتکز ہو جائے۔ پھر یہی شکرِ الٰہی اس امر کو مستلزم ہے کہ ایسا انسان شرک سے بالکلیہ اجتناب اور توحید کا التزام کرے۔ لہٰذا لقمان حکیم نے' جن کو اللہ تعالیٰ نے دانائی اور حکمت عطا کی تھی' اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی روشنی میں ''توحید'' کی معرفت اور جذبۂ شکر سے سرشار ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اسی لیے وہ اپنے بیٹے کو نہایت ہی دلنشین اور پیار بھرے انداز میں نصیحت کرتے ہیں کہ:

﴿ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕؔ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾ ﴾

''اے میرے پیارے بچے! دیکھنا کہیں اللہ کے ساتھ (اُس کی ذات و صفات میں) کسی کو شریک نہ ٹھہرا لینا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے''۔

## ادائے حقوق

ہم نے دیکھا تھا کہ سورۃ العصر اور آیۂ بِر میں ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کا ذکر ہے۔ یہاں ان کے ضمن میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آئی ہے وہ ادائے حقوق ہے اور اُن میں بھی اوّلین ذکر والدین کے حقوق کا ہے۔ قرآن حکیم میں آپ کو کئی مقامات پر یہ اسلوب ملے گا کہ ادائے حقوق کے معاملے میں جہاں اللہ تعالیٰ کے اِس حق کا تذکرہ ہوگا کہ صرف اور صرف اُس کی عبادت کی جائے' شرک سے کلی اجتناب اور توحید





کے کامل التزام کے ساتھ' وہاں اللہ کے اِس حق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا بیان ہوگا۔ جیسے یہاں ہم نے دیکھا کہ حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو اجتنابِ شرک اور التزامِ توحید کی نصیحت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جا رہا ہے کہ:

﴿وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ﴾ (آیت۱۴)

''اور ہم نے انسان کو نصیحت کی اس کے والدین کے بارے میں......''

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا......﴾ (آیت۸۳)

''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔''

اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ﴾ (آیت۱۵۲)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے ربّ نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں! یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾ (آیت۲۳)

''اور تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

## والدہ کا خصوصی حق

اس رکوع میں جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' والدین کے حقوق کا ذکر کر کے والدہ کے حق کو نمایاں کیا گیا اور اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کی تاکید فرمائی گئی:

﴿وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی وَہۡنٍ وَّفِصٰلُہٗ فِیۡ

عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے انسان کو وصیت کی اس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں' کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا' میری ہی طرف لوٹنا ہے''۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اصل میں ایک جامع عنوان ہے اس بات کا کہ اس دنیا میں انسان زندگی بسر کرتا ہے تو اس پر بہت سے لوگوں کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں جنہیں اسے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ انہیں شریعت کی اصطلاح میں ''حقوق العباد'' کہا جاتا ہے اور ان میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں' اس میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ انسان پر سب سے بڑا احسان تو بلا شک و بلا ریب اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس کا خالق ہے' مالک ہے اور پروردگارِ حقیقی ہے۔ لیکن اللہ کے بعد انسان سب سے زیادہ زیر بارِ احسان ہے اپنے والدین کا جنہوں نے اسے پالا پوسا' اپنا پیٹ کاٹ کر اسے کھلایا پلایا' اپنے آرام کو تج کر اس کے آرام کی فکر کی' اس کی تکلیف پر بے چین ہوتے رہے۔ پھر اُن میں بالخصوص والدہ کا حق بہت فائق ہے۔ لہٰذا والدین کے ذکر کے بعد یہاں والدہ کا خاص طور پر ذکر آیا ہے' جس نے اسے ضعف پر ضعف برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ پیدائش کے بعد پھر وہ دو سال تک جونک کی طرح اس کی چھاتی سے چمٹ کر دودھ کی شکل میں اس کے جسم و جان کی توانائیاں چوستا رہا اور اس نے اپنی توانائیوں کو بہترین غذا بنا کر اس کے جسم میں اتارا' لہٰذا والدین بالخصوص والدہ کے اولاد پر یہ احسانات نہایت عظیم ہیں۔ چنانچہ انسانوں کے حقوق میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں۔

یہاں والدہ کے حقوق کے فائق ہونے کے ضمن میں دو مشہور احادیث کا ذکر مناسب رہے گا۔ ایک یہ کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے''[1]۔ یعنی ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک انسان کے جنت میں داخل

(۱) سنن النسائی' کتاب الجهاد' باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الجهاد' باب الرجل يغزو وله ابوان۔



ہونے کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ''میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟'' تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ صحابیؓ نے پھر پوچھا: ''اس کے بعد؟'' جواب ملا: ''تیری ماں''۔ صحابیؓ نے تیسری مرتبہ دریافت کیا: ''اس کے بعد؟'' آپؐ نے پھر فرمایا: ''تیری ماں''۔ چوتھی مرتبہ صحابیؓ کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوا: ''تیرا باپ''[1]۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ کے مقابلے میں ماں کا حق تین گنا فائق ہے۔

## ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت لقمان نے وصیت کرتے ہوئے بیٹے کو اللہ کا حق تو بتا دیا کہ ''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا'' لیکن خود اپنے حقوق کو بیان کرنا انہیں زیب نہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس مضمون کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے فرما دی اور حضرت لقمان کی نصیحتوں کے سلسلے میں ایک بات اپنی طرف سے داخل فرما دی جو والدین کے حقوق سے متعلق ہے۔ البتہ اس کے نتیجے میں ایک سوال خود بخود پیدا ہو گیا' یعنی یہ کہ اگر دونوں حقوق ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں' اور باہم ٹکرا جائیں' یعنی ایک اللہ کا حق' دوسرے مخلوقات میں سے سب سے فائق والدین کا حق' اور خود والدین اپنی اولاد کو شرک پر مجبور کریں تو اس صورت میں اولاد کیا کرے؟ —— یہ ایک بالکل عملی مسئلہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر جو لوگ ابتدا ہی میں ایمان لائے اُن میں متعدد نوجوان بھی تھے۔ ان میں سے دو نوجوانوں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کا ذکر بہت مناسب ہے۔ ان کے لیے سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا کہ اُن دونوں کی مائیں مشرک تھیں۔ وہ انہیں اپنے حقوق کا واسطہ دے کر مجبور کر رہی تھیں کہ اپنے آبائی دین کو ترک نہ کرو' اس میں واپس آ جاؤ۔

(۱) صحيح البخاری' کتاب الآداب' باب من احق الناس بحسن الصحبة۔ وصحيح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب بر الوالدين وانهما احق به۔

ان نوجوانوں کی ماؤں نے بھوک ہڑتال اور مرن برت تک کی دھمکیاں دیں۔ اب ان سعادت مند، سلیم الفطرت اور صحیح العقل نوجوانوں کے سامنے یہ عملی سوال آیا کہ اب کیا کریں؟ —— ظاہر بات ہے کہ سعادت مند اولاد کو فطری طور پر ماں باپ کے حقوق کا شعور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے لیے ایک عملی پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ قرآن مجید نے اسی سیاق وسباق میں آگے اس کا حل پیش کر دیا:

﴿ وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾

''اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی علم نہیں تو اُن کا کہنا مت مان''۔

البتہ یہ نہیں فرمایا کہ اس طرح ان کے سارے حقوق ساقط ہو گئے۔ ایسا معاملہ نہیں ہے۔ شرک پر مجبور کرنے کے ضمن میں تو اُن کی حکم عدولی کی جائے گی، لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم باقی اور برقرار رہے گا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ ﴾

''اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر (یعنی بھلے طریقے سے)''۔

لیکن اس کے ساتھ ہی بارِ دگر تنبیہ کر دی گئی کہ حسنِ سلوک میں اتباع یعنی پیروی شامل نہیں ہے۔ پیروی صرف اُس شخص کی کی جائے گی جس نے اپنا رُخ اللہ کی طرف کر لیا ہو! چنانچہ فوراً ہی ارشاد ہوا:

﴿ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ﴾

''اور اتباع کرنا اُس کا جس نے اپنا رُخ میری طرف کر رکھا ہو''۔

مشرک والدین کا اتباع یا اُن کے نقشِ قدم کی پیروی نہ عقلاً لازم ہے نہ نقلاً واجب!

## نگاہِ بازگشت

الحمد للہ کہ ہم نے اب تک اس رکوع کے نصف اوّل یعنی چار آیات کا طائرانہ جائزہ لے لیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے آیئے کہ ان کے مضامین پر نگاہِ بازگشت ڈال لیں۔ اس کی پہلی آیت میں حضرت لقمان کا تعارفی ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ان کی





نصائح کا آغاز ہوا جن میں سے اوّلین اور اہم ترین نصیحت اجتناب عن الشرک کی پُرزور تاکید پر مشتمل تھی۔ بعد کی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس وصیت کا اپنی جانب سے ذکر فرما دیا جو جبلی طور پر بھی انسان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور اس کی توثیق الہام اور وحی کے ذریعے بھی ہوئی ہے۔ پھر اگر حقوق اللہ اور حقوق الوالدین میں ٹکراؤ ہو تو ایک موحّد کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کی ہدایت کر دی گئی۔ اس کے بعد پھر سے حضرت لقمان کی نصائح کا ذکر شروع ہوا جس میں دوسری نصیحت مکافاتِ عمل یعنی معاد سے متعلق ہے، اس کے بعد رکوع کے اختتام تک حضرت لقمان کی چند عملی نصیحتوں کا ذکر چلتا ہے۔

البتہ سورۃ العصر اور آیۃ البرّ کے مضامین کے ساتھ تقابل اور موازنہ کے حوالے سے بہتر ہوگا کہ مضمون مکمل ہو جائے اور چند اشارات کر دیے جائیں۔ آپ نے جان لیا کہ سورۃ العصر میں ایمان کی جامع اصطلاح اور آیۃ البر میں ایمانیات کی قدرے تفصیل مذکور تھی۔ اس کے مقابلے میں یہاں ایمان باللہ کا ذکر اللہ کے شکر اور اجتناب عن الشرک کی تاکید کی شکل میں آ گیا اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر مکافاتِ عمل کے حوالے سے ہو گیا۔ پھر عملِ صالح کے ضمن میں بھی سورۃ العصر میں صرف ایک جامع عنوان وارد ہوا تھا جبکہ آیۂ بر میں عملِ صالح کے تین اہم گوشوں کی تفصیل مذکور تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ یہاں بھی ہے، حتیٰ کہ جیسے آیۂ بر میں انسانی ہمدردی کا ذکر مقدم تھا اقامتِ صلوٰۃ پر، یہاں بھی والدین کے حقوق کا ذکر پہلے آیا ہے اور صلوٰۃ کا ذکر بعد میں۔ اس کے بعد یہاں آپ مزید اعمالِ صالحہ شمار کریں گے تو آخری دو آیات میں تواضع، انکساری اور فروتنی کا معاملہ آئے گا۔ ''صعر'' اونٹ کی گردن کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں جب تمکنت پیدا ہو جاتی ہے تو غرور کی وجہ سے چال میں اکڑ، اندازِ گفتگو میں بے اعتنائی اور کج ادائی آ جاتی ہے۔ حضرت لقمان کی نصائح کے ذریعے سے ان چیزوں سے روکا گیا، اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ مغرور اور اترانے والے لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ مزید برآں عملی زندگی میں ہر

اعتبار سے اعتدال اور توازن کی تاکید کی گئی۔

سورۃ العصر میں تیسری چیز تھی تواصی بالحق۔ یہاں اس کے ضمن میں ایک معین اصطلاح آ گئی ہے‘ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ چنانچہ اقامتِ صلوٰۃ کے تاکیدی حکم کے معاً بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

’’اور نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو‘‘۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارے دین کی بڑی اہم اصطلاحات ہیں‘ اتنی اہم کہ اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ تأسیس ہی اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں انہی اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۰)

’’(اے مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جسے دنیا والوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ نیکی کا حکم دو‘ بدی سے روکو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھو‘‘۔

سورۃ العصر میں آخری چیز تھی تواصی بالصبر۔ یہاں حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بیان آ گیا۔ آنجناب اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ:

﴿ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۷﴾

’’اور صبر کر اُن مصائب پر جو (بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے پر) تجھے درپیش ہوں۔ یقیناً یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی) بڑے ہمت اور حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

نیکی کا حکم‘ نیکی کی تلقین اور بدی سے روکنا‘ اس پر نکیر‘ اس کو عام طور پر ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا تمسخر و استہزاء‘ تضحیک و توہین‘ مصائب و شدائد اور ابتلاء و امتحان اس راہ کے لوازم میں سے ہیں‘ ان کو جھیلنا اور برداشت کرنا ہوگا۔

یہ ہے اس رکوع کے مضامین کا خلاصہ جو بادنیٰ تأمل ہمارے سامنے آ گیا۔



دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حکمت و دانائی کا وافر حصہ عطا فرمائے اور یہ حکمت و دانائی محض ذہن و فکر کی حد تک محدود نہ رہے بلکہ ہماری سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات میں رچ بس جائے اور ہماری شخصیت کا ایک جزوِ لاینفک بن جائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

## آیاتِ مبارکہ کا بطریقِ تدبّر مطالعہ

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ درس کے بالکل آغاز میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ فہمِ قرآن کے دو درجے ہیں۔ ایک تذکر بالقرآن‘ یعنی آیات اور سورتوں کے مطالعے سے ان کا اصل سبق اور اُن کا لبِّ لباب حاصل کر لیا جائے‘ گویا بنیادی ہدایت اخذ کر لی جائے‘ دوسرا تدبر قرآن‘ یعنی قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی جائے‘ ایک ایک لفظ پر تدبر و تفکر کا حق ادا کیا جائے‘ آیات کے باہمی ربط اور سورتوں کے داخلی اور خارجی نظم کا فہم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم نے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر بطریق تذکر اختصار کے مدنظر جس حد تک ممکن ہو سکا وہ اساسی رہنمائی اخذ کر لی ہے جو اِس رکوع کے اصل سبق سے متعلق ہے۔ اب ہمیں اس رکوع پر بطریقِ تدبّر غور کرنا ہے۔

یہ رکوع اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمتِ قرآنی کی اساسات متعین ہوتی ہیں۔ ’’حکمت‘‘ کا لفظ اردو میں مستعمل ہے اور بالعموم اس کو ہم فلسفہ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کرتے ہیں‘ یعنی فلسفہ و حکمت‘ لیکن یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ فلسفہ اور حکمت میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ فلسفے کا دار و مدار خالصتاً عقل پر ہے۔ چنانچہ فلسفہ منطق کے اصولوں پر آگے بڑھتا ہے‘ جبکہ حکمت کی اصل اساس بدیہیاتِ فطرت پر ہے اور اس عمارت کی تعمیر فطرت کے مسلّمات کی بنیاد پر ہوتی ہے‘ اگرچہ عقلِ سلیم اسے ایک ہنرمند معمار کی طرح اُوپر اٹھاتی ہے‘ بالکل ایسے جیسے قرآن حکیم میں کلمۂ طیبہ اور عملِ صالح کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کیا گیا کہ:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ﴾ (فاطر: ۱۰)

”اسی کی جانب بلند ہوتے ہیں کلماتِ طیبات اور عمل صالح انہیں اُوپر اٹھاتا ہے۔“

واضح رہے کہ ہماری فطرت میں کچھ حقائق مضمر ہیں جنہیں ہم اپنے شعور کی تحتانی سطح پر محسوس کرتے ہیں' اور چاہے ہم ان کے لیے کوئی دلیل نہ دے سکیں لیکن فطرت کے ان مضمر حقائق کا ہم نہ انکار کر سکتے ہیں نہ ابطال۔ ان بدیہیاتِ فطرت کو بنیاد بنا کر جب تعقل و تفکر کا عمل آگے بڑھے تو اس طرح جو دولتِ عظمیٰ حاصل ہو گی وہ ”حکمت“ ہے۔ ذرا اِس لفظ ”حکمت“ کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ عربی زبان میں ”ح ک م“ کے مادے سے جو الفاظ بنتے ہیں ان سب میں آپ کو کسی شے کی پختگی اور مضبوطی کا مفہوم مشترک ملے گا۔ چنانچہ اسی سے لفظ استحکام بنا ہے جسے عام طور پر ہمارے یہاں استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز مستحکم ہے' یعنی بہت پختہ اور مضبوط ہے۔ ”حکمت“ اصل میں انسان کی عقل و شعور کی وہ پختگی ہے کہ جس سے اس میں اصابتِ رائے پیدا ہو جائے' اس میں صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے' اس میں صحیح و غلط میں فرق و امتیاز کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اور اسے صحیح حقائق تک رسائی حاصل ہو جائے۔ ان تمام اوصاف کو جمع کریں تو انسان میں جو قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو گی وہ ”حکمت“ ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۹ میں ”حکمت“ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بہت بڑا انعام و احسان اور بہت بڑا فضل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ج﴾

”اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔“

اور:

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط﴾

”اور جسے حکمت عطا ہو گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا۔“

گویا اسے نہایت قیمتی اور کمیاب شے مل گئی۔ چنانچہ ہمارے دین کی ایک اعلیٰ قدر حکمت ہے۔ یعنی عقل و شعور کی پختگی' دانائی' حقائق رسی کی صلاحیت' اصابتِ رائے' نیکی اور



بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت اور خیر و شر میں فرق کرنے کی قابلیت۔ جس کو اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ عطا فرما دے اس پر اللہ تعالیٰ کے انعام' احسان اور فضل کا کیا کہنا! اس موقع پر مناسب ہے کہ حکمت کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث بھی بیان کر دی جائے۔ آنحضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ ' فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا)) (۱)

”حکیمانہ بات مؤمن ہی کی گمشدہ متاع کے مانند ہے' وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے جہاں کہیں بھی اسے پائے۔“

یعنی جیسے ہماری کوئی چیز کہیں کھو گئی ہو اور پھر وہ ہمیں کہیں نظر آئے تو ہم اس کی طرف لپکتے ہیں کہ یہ میری چیز ہے۔ اس فعل میں ہمیں کوئی رکاوٹ اور کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ بالکل اسی نوعیت کا معاملہ مؤمن کا ہے کہ حکمت و دانائی اسے جہاں بھی نظر آئے گی وہ اسے لپک کر قبول کر لے گا' بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص اپنی کسی گم شدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے لپکتا ہے۔ بلکہ حضور ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ مؤمن حکمت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

## حکمتِ قرآنی کی اساسِ اوّل: شکرِ خداوندی

سورۂ لقمان کے اس رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو ہوئی' لیکن حکمتِ قرآنی کی دو اساسات کو متعین کر دیا گیا۔ پہلی اساس ہے شکرِ خداوندی۔ یہاں مناسب ہو گا کہ لفظ ”شکر“ کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے' لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ شکر کسے کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں' تو جواب ملے گا کہ شکر' شکر ہوتا ہے۔ اس کے لیے اکثر لوگ شاید کوئی دوسرا لفظ استعمال نہ کر سکیں۔ شکر کیا ہے! اس کی امام راغب اصفہانیؒ نے بڑی عمدہ تشریح فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”شکر کے معنی ہیں کسی احسان و انعام کا ادراک و تصور اور اس کا

(۱) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة۔ و سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب الحکمة' عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ۔

اظہار و اعتراف''۔ اس کے برعکس جو کیفیت ہے وہ ''کفر'' ہے۔ اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا گیا:

﴿ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿١٢﴾ ﴾

''اور جو شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جس نے کفر کیا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں ستودہ صفات (اور از خود محمود) ہے۔''

عام طور پر کفر کے معنی صرف انکار کے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی دین کی کسی بنیادی بات کا انکار کرے' توحید کا منکر ہو یا اللہ کی صفاتِ کمال کا منکر ہو' اسی طرح رسالت کا منکر ہو یا ختمِ نبوت کا منکر ہو' آخرت کا منکر ہو یا جنت اور دوزخ کا منکر ہو تو ایسا شخص کافر ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صد فیصد صحیح ہے' لیکن لغوی اعتبار سے اصل میں کفر' شکر کی ضد ہے۔ یہ دونوں الفاظ ''شکر و کفر'' متضاد معنی کے حامل (antonyms) ہیں۔ شکر یہ ہے کہ انسان کو نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار کرے۔ اور کفر کے معنی ہیں چھپا دینا' دبا دینا' لہٰذا جب یہ شکر کے مقابلے میں آئے گا تو اس کا مفہوم ہوگا ناشکرا پن یا کفرانِ نعمت۔

آپ تھوڑے سے غور سے اس نتیجہ تک خود پہنچ جائیں گے کہ شکر فطرت کا جزوِ لاینفک ہے' بشرطیکہ فطرت صحیح ہو اور مسخ نہ ہوئی ہو۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ یہ معاملہ صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اگر کوئی بھوکا پیاسا جانور ہو' آپ نے اس کے سامنے چارہ یا پانی رکھ دیا اور اس نے اپنی بھوک یا پیاس مٹائی تو اب وہ گردن اٹھا کر جب آپ کو دیکھے گا تو آپ کو اُس کی آنکھوں میں جذبۂ تشکر چھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ فطرت ہے اور اچھی طرح جان لیجیے کہ فطرت کی صحت کی علامت یہ ہے کہ انسان میں شکر کا جذبہ موجود ہو۔ اگر یہ کیفیت ختم ہو جائے تو ایسا شخص ایک ناشکرا انسان ہوگا کہ اس کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور اسے احساس بھی نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ بھلائی کی ہے' اسے شعور تک نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا ہے۔ ایسے شخص کے



لیے حکم لگایا جائے گا کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے یا بالفاظِ دیگر اس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ عرب ابلتے چشمے کو ''العَین الشکرٰی'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ چشمہ جس سے پانی ابل رہا ہے۔ پھر ''دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ'' اس جانور اور اس حیوان کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی ٹہل سیوا کی جائے' اچھا کھانے پینے کو دیا جائے تو وہ فربہ ہوتا ہے۔ اس دیکھ بھال اور اچھی غذا کا اس کے وجود میں ظہور ہوتا ہے تو اسے وہ دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ کہتے ہیں۔ لہٰذا شکر فطرت کے اس جذبے کو کہتے ہیں جو کسی نعمت اور کسی احسان پر انسان کے باطن سے ابھرتا ہے۔ اب اس فطری اساس پر عقلِ سلیم کے ذریعے اضافی تعمیر ہوگی۔ عقل کا وظیفہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ اپنے محسنِ حقیقی کو پہچانے اور اس طرح اس کے شکر اور احسان مندی کے جذبے سے اس کا ذہن و قلب سرشار ہو جائے۔

ذرا غور فرمائیے کہ جب انسان عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا ابھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین ہی کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہی میرے رازق ہیں' یہی میرے محافظ ہیں' یہی میرے دکھ درد محسوس کرنے والے ہیں' مجھے کوئی تکلیف ہو تو اسے یہی رفع کرنے والے ہیں' لہٰذا اس کا غیر شعوری جذبۂ شکر اپنے والدین کی ذات پر مرتکز رہتا ہے' لیکن جیسے جیسے فکرِ انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے اور عقل اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے' انسان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو انسان کو معلوم ہوتا چلا جاتا ہے کہ میں تو بہت سوں کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میرا وطن ہے' میری قوم ہے' میرے اعزہ واقرباء ہیں۔ یہ سب کے سب میرے محسن ہیں' میری بھلائی کے لیے سوچتے ہیں۔ میں درجہ بدرجہ ان سب کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ اسی طرح گویا جذبۂ شکر پھیل رہا ہے۔ پھر انسان یہاں تک سوچتا ہے کہ یہ زمین جس سے مجھے غذا حاصل ہو رہی ہے' یہ سورج جس سے یہ سارا نظام چل رہا ہے' فصلیں پک رہی ہیں' بارشیں ہو رہی ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے تو میں ان میں سے ہر چیز کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میری جو ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو اس پوری کائنات کی ایک ایک شے میری ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی میں لگی ہوئی

ہے۔اس طرح یہ شکر پھیل کر کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے!

اس کے بعد اگر انسان ایک چھلانگ اور لگائے' فکر انسانی اگر ایک قدم اور اٹھالے تو وہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ یہ تمام مظاہرِ فطرت اور ان میں جو تعدّد نظر آ رہا ہے' ان میں جو توافق اور نظم نظر آ رہا ہے' ان سب کا منبع اور سرچشمہ کوئی ایک ذات ہے۔سورج میں جو تمازت ہے وہ اس کی اپنی نہیں' کوئی اور ہے جس نے اس میں یہ حرارت و تمازت رکھی ہے۔کسی شے میں اگر کوئی وصف ہے تو وہ اس کا ذاتی نہیں' کسی کا عطا کردہ ہے۔ایک خالق' ایک ربّ' ایک منعم ہے جس کے انعامات و احسانات کا یہ پورا سلسلہ اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔نتیجہ کیا نکلے گا! یہ کہ غور و فکر اور عقل کا یہ ذہنی سفر جب اس حد کو پہنچ جائے گا تو وہ شکر جو والدین کی ذات سے شروع ہو کر پھیلتا ہوا کائنات کی وسعتوں کو محیط ہو گیا تھا' ایک ذات پر مرتکز ہو جائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ شکر کا مستحقِ حقیقی اللہ ہے۔ یہاں فطرت اور تعقل کے امتزاج سے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ معرفتِ توحیدِ باری تعالیٰ ہے جس کا نتیجہ شکرِ خداوندی ہے۔اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ﴾

''اور بے شک ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی اور حکمت سے نوازا کہ شکر کر اللہ کا''۔

معلوم ہوا کہ یہاں کلمہ ''اَنْ'' حکمت و دانائی کے لازمی و منطقی نتیجے کی جانب رہنمائی کے لیے آیا ہے۔گویا وہ عقلیت سرے سے حکمت قرار ہی نہیں دی جا سکتی جس سے شکرِ خداوندی کی کیفیت قلب و ذہن میں پیدا نہ ہو۔

مزید برآں اس شکر کے تین درجے ہیں۔امام راغبؒ نے بہت خوبصورتی سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شکر کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نعمت کا احساس و ادراک ہو۔ظاہر بات ہے کہ اگر کسی بچے کے ہاتھ پر کوہِ نور ہیرا رکھ دیا جائے تو اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ اسے کیا چیز دی گئی ہے! وہ اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھے گا۔لہٰذا جس درجے کا شکر اس میں پیدا ہونا چاہیے وہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ اسے شعور ہی



نہیں ہے کہ مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا گیا ہے! پس پہلا درجہ ہو گا نعمت کا کماحقہٗ ادراک و شعور۔دوسرا درجہ ہو گا شکر باللّسان' یعنی زبان سے بھی منعم و محسن کی حمد و ثنا ہو' جسے ہم شکریہ ادا کرنا کہتے ہیں۔ جیسے ''thanks'' اور ''شُکرًا'' کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ متمدن و مہذب معاشرہ میں سب سے زیادہ کہے اور سنے جانے والے الفاظ ہوں گے۔ پھر تیسرا درجہ ہے شکر بالجوارح کا' یعنی اس نعمت کا حق اپنے پورے وجود سے ادا کرو۔اگر کسی بچے کو اس کے والد نے بہت عمدہ کتاب لا کر دی' بچہ مہذب تھا' اس نے اپنے والد کا شکریہ ادا کر دیا' لیکن پھر اس نے اس کتاب کو طاقِ نسیان پر رکھ دیا اور اس سے کوئی استفادہ نہ کیا تو یہ ناشکرا پن ہے' ناقدری ہے۔لہٰذا نعمت کا حق ادا کرنا بھی شکر کا تقاضا ہے۔

الغرض شکر تقاضائے فطرت ہے' اور عقلِ سلیم کا مآل یہ ہے کہ اپنے اصل محسن و منعم اور خالق و مالک کو پہچان لے۔اور ان دونوں کے امتزاج سے اللہ کے شکر و امتنان کے جذبات کا چشمہ دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور اس کی حمد و ثنا کے زمزمے انسان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں! پھر شکرِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا حق ادا کرے' اور اللہ کا سب سے بڑا حق وہ ہے جسے اگلی آیت میں حضرت لقمان کی پہلی نصیحت میں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے پیارے بچے! دیکھنا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا' بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔''

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بے حد و حساب نعمتیں ملی ہیں' اس پر احسانات کی جو بارش ہوئی ہے تو انسان سے اس کی نعمتوں کا جو عظیم ترین حق مطلوب ہے وہ التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک ہے۔ یہ بہت اہم موضوع ہے۔

## حکمتِ قرآنی کی اساس دوم

اس رکوع میں حکمتِ قرآنی کی جو دوسری بات آئی ہے اب اس پر غور کیجیے۔ وہ

بات معروف اور منکر یعنی نیکی اور بدی کا تصور ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں نیکی اور بدی کی پہچان اللہ کی جانب سے ودیعت شدہ موجود ہے۔ انسان ان میں طبعاً امتیاز کرتا ہے' اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ سچ بولنا اچھا ہے' جھوٹ بولنا برا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت اس بات سے واقف ہے کہ سچائی نیکی ہے اور جھوٹ بدی ہے۔ وعدہ پورا کرنا نیکی ہے' وعدے کی خلاف ورزی کرنا بدی ہے۔ دیانت وصداقت اعلیٰ اقدار ہیں' خیانت وکذب برائیاں ہیں۔ ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک خیر ہے' ہمسائے کو پریشان کرنا اور اسے اذیت پہنچانا شر ہے۔ چنانچہ قرآن نے نیکی کے جملہ اعمال ومظاہر کے لیے جو اصطلاح اختیار کی ہے وہ ہے ''معروف''۔ معروف کے معنی ہیں ''جانی پہچانی چیز''۔ اس کے برعکس بدی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''منکر'' ہے۔ منکر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہچان میں نہ آئے' جس سے انسان کی طبیعت کو نفرت اور اباء ہو۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے ان دو الفاظ کے حوالے سے حکمت کے نہایت اہم مسائل پر سے پردے ہٹا دیے ہیں اور ان کو مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے بدی کیا ہے' خیر کیا ہے شر کیا ہے! بلکہ فطرتِ انسانی کا میلان نیکی کی طرف ہے۔ وہ اس کی فطرت کی جانی پہچانی چیز ہے۔ اس کا طبعی رجحان نیکی کی طرف ہے' بدی کی طرف نہیں۔ وہ بدی سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ یہ بالکل علیحدہ بات ہے کہ بالکل غیر معمولی حالات میں یا غلط ماحول سے متاثر ہو کر انسان بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے' لیکن اس کی فطرت اسے متنبہ کرتی رہتی ہے اور اس کا ضمیر اس کو ٹوکتا رہتا ہے کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو' اِلاّ یہ کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو۔ الغرض یہ ہے حکمتِ قرآنی کی دوسری اہم اساس جس کا تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔

یہ بات اس منتخب نصاب میں آئندہ واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ اگر نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو نیکی کی جزا ملنی چاہیے اور بدی کی سزا۔ ع گندم از گندم بروید جو زِ جو۔ اگر گندم سے گندم اور جو سے جو پیدا ہوتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ نیکی کی



جزا اور بدی کی سزا نہ ملے جو بالعموم اس دنیا میں نہیں ملتی' لہٰذا اس کے لیے کسی دوسرے عالم کی ضرورت ہے۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ نیکی اور بدی برابر ہیں' ان میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ اس کو قبول نہیں کرتی۔ فطرت اور عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے اور نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا نکلنا چاہیے۔ مکافاتِ عمل کی یہی بات حضرت لقمان نے کہی: ''اے میرے پیارے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو' پھر خواہ وہ کسی چٹان میں کی گئی ہو یا کہیں فضا کی پہنائیوں میں کی گئی ہو یا کہیں زمین کے پیٹ میں گھس کر کی گئی ہو' اللہ اس کو لے آئے گا''۔ یہ اعمالِ انسانی ضائع جانے والے نہیں۔ یہ ہیں وہ امور جن کو قرآن حکمت سے موسوم کرتا ہے اور جن تک انسان غور وفکر کے نتیجے میں از خود پہنچ سکتا ہے۔ اگر آپ ان کے لیے لفظ فلسفہ استعمال کرنا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کے فلسفہ کی عمارت ان اساسات پر تعمیر ہوتی ہے۔

## چند امور کی وضاحت

حکمتِ قرآنی کی اساسات کے ضمن میں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔

۱) انسان پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو فرض کے درجے میں ہے۔ جو شخص اللہ کے شکر کی روش اختیار کرے گا اس کی فطرت میں دوسرے محسنین کے شکر کی عادت اور خُو بھی یقیناً پیدا ہو گی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ((مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ))(۱) ''جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا''۔ اس لیے کہ جس کنویں کا پانی خشک ہو چکا ہو اُس میں ڈول کوئی بھی ڈالے پانی نہیں نکلے گا۔ جس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہوں اس میں سے شکر کا جذبہ نہ انسانوں کے لیے برآمد ہو گا نہ اللہ کے لیے۔

۲) اگر انسان کی فطرت میں شکر کا مادہ ہے اور احسان مندی کا جذبہ ہے تو اس کی اپنی

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة' باب ما جاء فی الشکر لمن احسن الیك۔ ومسند احمد' کتاب باقی مسند المکثرین' باب مسند ابی هريرة رضی اللّٰه عنه۔

شخصیت کا ارتقاء صحیح رُخ پر ہوگا۔ معاذ اللہ! اللہ کو شکر کی احتیاج نہیں ہے' کوئی اس کی حمد وثنا کرے نہ کرے وہ تو اپنی ذات میں غنی ہے' حمید ہے' از خود محمود ہے' ستودہ صفات ہے' اس کو شکر کی حاجت نہیں ہے۔ شکر کی ضرورت خود انسان کو ہے۔ یہ جذبہ اس کے اندر اگر موجود ہے تو اس کی شخصیت کا صحیح سمت میں ارتقاء ہوگا اور اس کی خودی اور سیرت کی تعمیر صحیح اساسات پر ہوگی۔

۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں انسان کو اپنی ذات اور اپنے نفس کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دوسروں کو تو نیکی کی نصیحت و تلقین کریں اور خود اُس پر عامل نہ ہوں۔ برائی پر ہم دوسروں کی نکیر کریں' ان پر تنقید کریں اور اپنی برائیوں پر نہ نظر ڈالیں نہ ان کو دور کرنے کی فکر کریں۔ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل کے جرائم میں جو فہرست بیان ہوئی ہے اس میں ایک جرم یہ بھی فرمایا گیا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ:۴۴)

''کیا تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہو (اور انہیں اس کی تلقین و نصیحت کرتے ہو) اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو!''

تو انسان میں یہ دونوں وصف بیک وقت مطلوب ہیں۔ وہ اپنی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے مدد ومعاون ہوں گی۔

۴) ایک بات یہ بھی سمجھ لیجیے کہ عربی زبان میں ''امر'' جہاں حکم کے معنی میں آتا ہے وہاں تلقین' نصیحت اور مشورے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس کے معانی کلام کے سیاق وسباق کے اعتبار سے متعین ہوتے ہیں۔

۵) آخری بات یہ کہ احادیثِ نبویہ میں سارا زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے۔ اس کی حکمت بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آتی ہے۔ جس معاشرے میں برائیوں کو گوارا کیا جائے' ان سے صرفِ نظر اور اعراض کیا جائے' ان کو روکنے اور مٹانے سے غفلت اختیار کی جائے تو معاشرے میں نیکیوں کے فروغ اور نشوونما کے لیے ماحول قطعی ناسازگار



ہو جائے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی پھل پھول والے پودے کے ساتھ جو جھاڑ جھنکاڑ اُگ آتا ہے اگر باغبان اس کی صفائی نہ کرے تو زمین اور فضا سے ملنے والی غذائیں اس پودے کے بجائے یہ جھاڑ جھنکاڑ ہڑپ کر جائیں گے اور پودے کو پنپنے اور نشوونما کے لیے غذا مہیا ہی نہیں ہو سکے گی۔

۶) معاشرے سے برائیوں کو دور کرنے کے حدیث میں تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ))

یعنی تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو پہلا درجہ عزیمت کا ہے کہ طاقت سے برائی کو روک دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے تلقین کی جائے' نصیحت کی جائے کہ کیا کر رہے ہو' باز آ جاؤ۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حالات اتنے بگڑ جائیں کہ زبانوں پر تالے ڈال دیے جائیں' زبان بندی ہو جائے' تو دل میں یہ احساس ضرور رہے' صدمہ ضرور رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! ایک شدید کرب کا احساس باقی رہے۔ یہ آخری درجہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))[1] ''اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اگر برائیوں پر دل کی کڑھن بھی موجود نہ رہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کی رمق بھی اندر باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان ...... عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

# حقیقت واقسامِ شرک

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حکمتِ قرآنی کی جو اساسات بیان ہوئی ہیں اور جس مقامِ عزیمت کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے اس کے حوالے سے اختصار و اجمال کے ساتھ رکوع کا لبِّ لباب اور اس کا اصل حاصل بیان ہو گیا' **فللّٰہ الحمد**۔ اب اس رکوع کی آیت ۲ پر مزید غور کرنا مقصود ہے' کیونکہ اس میں اجتناب عن الشرک کی تاکید کے ضمن میں التزامِ توحیدِ باری تعالیٰ کا انتہائی تاکیدی حکم وارد ہوا ہے' اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے دین کی اصل جڑ بنیاد توحید ہی ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان کی نصائح کے ضمن میں پہلی نصیحت بایں الفاظ بیان فرمائی گئی:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے پیارے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کر' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

اس سلسلے میں پہلی اور اہم ترین بات تو یہ جان لینی چاہیے کہ از روئے قرآن مجید ہمارے دین میں شرک سب سے بڑا گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے۔ سورۃ النساء میں دو مرتبہ اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت ۴۸ کے الفاظ ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾﴾

''اللہ تعالیٰ اس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کمتر خطائیں اور تقصیریں جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا' اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ گھڑا (اور بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا)۔''

اسی سورۃ کی آیت ۱۱۶ میں یہ مضمون دوبارہ اس شان کے ساتھ وارد ہوا کہ آیت کا پہلا حصہ بعینہٖ وہی ہے جو آیت ۴۸ کا ہے' دوسرے حصے میں معمولی تغیر ہے' چنانچہ



یہاں فرمایا:

﴿وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾

''اور جس نے بھی اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ بلاشبہ گمراہی اور ضلالت میں بہت دُور نکل گیا۔''

گویا یہاں یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ شرک میں ملوث ہونے والا انسان گمراہی میں اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لیے معافی اور بخشش کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ گناہ اور یہ جرم بہت ہمہ گیر ہے اور اتنا عام ہے کہ اللہ کو ماننے والوں کی اکثریت بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں ملوث ہو جاتی ہے۔ سورۃ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾

''اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی (کسی نہ کسی نوعیت کا) شرک بھی کرتے ہیں۔''

یعنی اکثر لوگ اللہ کو مانتے ہیں' اس پر ایمان لاتے ہیں' لیکن توحیدِ خالص کے ساتھ اللہ کو ماننا' اس پر ایمان رکھنا کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے شرک کی اسی ہمہ گیری کی طرف بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہیں تصویریں

تیسری اہم ترین بات یہ کہ شرک کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ مرض بہت متنوع صورتوں میں ظہور کرتا ہے' بلکہ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ ہر دَور کا ایک خاص شرک ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے دَور کے شرک کو نہ پہچان پائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ سابقہ ادوار کے تمام شرکوں سے بچا ہوا ہو اور اپنے خیال میں وہ بہت بڑا موحّد بنا پھرتا ہو لیکن وہ لاعلمی میں اپنے دَور کے شرک میں ملوث ہو گیا ہو۔ میرے نزدیک اس دَور کا جو شرک سب سے عام اور سب سے زیادہ پھیلا ہوا ہے وہ مادّہ پرستی کا شرک ہے۔

ہمارے ہاں مادّے اور اس کی تاثیرات پر پورا یقین و اعتماد کیا جاتا ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ پر اتنا بھی توکل، یقین اور اعتماد نہیں ہے جو ایمانِ حقیقی کے لیے لازمی و لابدی ہے۔ اقبال نے اسے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے کہا ہے کہ: ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ایمان اصل میں نام ہے اللہ پر توکل، اعتماد اور بھروسے کا، اور اس کی نفی کفر اور شرک ہے۔ لہٰذا شرک کے بارے میں بہت حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان کا ایک شعر ہے: ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

یعنی ''تم چاہے کسی رنگ کا لباس پہن لو، کوئی بھیس بدل لو، میں تمہیں تمہارے قد سے پہچان لوں گا''۔ شرک کے معاملے میں بھی بالکل یہی کیفیت درکار ہے کہ یہ بیماری جس صورت میں بھی کسی دَور میں اور کسی معاشرے میں ظہور کر رہی ہو، نگاہ اتنی دُوررَس ہو کہ انسان پہچان لے کہ اس دَور میں شیطان نے شرک کو اس صورت میں جلوہ گر کیا ہے، تب ہی اس بات کا امکان ہے کہ انسان شرک سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

چوتھی اہم بات جو درحقیقت ان تینوں باتوں کا منطقی نتیجہ ہے، یہ ہے کہ شرک سے کلیتاً بچنا آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں جب آتا ہے تو اکثر مقامات پر جہاں آ کر بات ختم ہوتی ہے وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ: ﴿مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ''آپ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے''۔ حضرت ابراہیمؑ کی عظمتِ جلیلہ کو ذہن میں رکھیے۔ آنجنابؑ ہمارے رسول اللہ ﷺ کے جدامجد ہیں، ابوالانبیاء ہیں، امام الناس ہیں اور خلیل اللہ ہیں۔ ہم درود میں بھی ان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آخری سند ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بندے کو عطا ہو جائے۔ یہ سب سے بڑا اور قیمتی سرٹیفکیٹ اور testimonial



ہے جو اللہ کی طرف سے کسی کو دیا جائے کہ ''میرا یہ بندہ شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے''۔

اب ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ شرک اصل میں کہتے کسے ہیں! شرک یعنی اشراک باللہ (اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر دینا) کی اصل حقیقت کیا ہے جس کو اس آیۂ مبارکہ میں ظلمِ عظیم قرار دیا گیا ہے؟ عربی زبان میں ظلم کی تعریف ہے ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ''، یعنی کسی چیز کو اُس کے اصل اور حقیقی مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا۔ یہ فعل ظلم کہلاتا ہے۔ ہر چیز کو اُس کے اصل و حقیقی مقام پر رکھیے، یہ عدل ہے، یہ انصاف ہے۔ اب غور فرمائیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ شرک میں دو چیزیں لامحالہ ہوں گی۔ یا اللہ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے گا اور کوئی صفت جو صرف مخلوقات کے لیے ہو گی اس سے اللہ کو متصف کر دیا جائے گا، یا مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر لا بٹھایا جائے گا اور جو صفات صرف باری تعالیٰ کے لیے مختص ہیں ان سے کسی مخلوق کو متصف تسلیم کیا جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں یکساں ''ظلم'' ہیں۔ یہ دونوں افعال ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کے ذیل میں آئیں گے۔ اللہ کو اس کی منفرد شانِ رفیع اور مقامِ جلیل سے گرانا بہت بڑا ظلم ہے اور مخلوق میں سے کسی کو اس کے اصل و حقیقی مقام سے اٹھا کر اللہ کا ہمسر، ہم پلہ، ند، ضد، کفو اور مدّ مقابل بنا دینا، یہ بھی بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔

## شرک فی الذات

اب اختصار کے ساتھ شرک کی چند اقسام کو سمجھئے۔ اگرچہ اس کی تقسیمیں مختلف اعتبارات سے ہو سکتی ہیں، لیکن جس پہلو سے میں تقسیم آپ کے سامنے رکھوں گا مجھے توقع ہے کہ شاید آپ اسے بہت جامع اور نہایت قابل فہم پائیں گے۔ شرک کی تین موٹی موٹی قسمیں ہیں۔ پہلی ''شرک فی الذات'' ہے، یعنی اللہ کی ذات میں کسی کو شریک بنا دینا۔ یہ بدترین اور عریاں ترین شرک ہے۔ دوسری ''شرک فی الصفات'' ہے۔ یہ معاملہ کسی علمی مغالطے کے باعث بھی ہو سکتا ہے۔ تیسری ''شرک فی الحقوق'' ہے، یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو اس کا ساجھی بنا دینا۔ لہٰذا شرک کی یہ تین بڑی بڑی قسمیں

پیشِ نظر رکھیے، پھر ان کو علیحدہ علیحدہ سمجھئے۔

شرک فی الذات یعنی ذاتِ باری تعالیٰ میں کسی کو شریک کر دینا، اس کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ مکروہ اور سب سے زیادہ گھناؤنی قسم ہے، عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ ان قوموں میں پیدا ہوئی جو اپنے آپ کو نبیوں اور رسولوں کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ مشرکینِ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام لیوا تھے، انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔ عیسائیوں نے یہ ظلم ڈھایا کہ اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ہی نہیں صلبی بیٹا قرار دے دیا۔ اس شرک پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ سورۃ مریم کی آیات ۸۸ تا ۹۲ میں اِس کا اظہار اس انداز سے فرمایا گیا ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْبَغِىْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾﴾

''انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ لوگو! تم بہت گستاخی کی بات کر رہے ہو۔ (یہ گستاخی اللہ کی جناب میں اتنی شدید ہے کہ) آسمان پھٹ پڑنے کو ہے، زمین شق ہونے کو ہے اور قریب ہے کہ پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائیں، (اس گستاخی پر) کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا تراش لیا۔ حالانکہ یہ بات رحمٰن کے شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔''

اس شرک فی الذات کی دوسری صورت پیدا ہوئی فلسفیانہ مذاہب میں۔ ان میں حلول اور تجسم کے عقیدے پیدا ہوئے جس کا مطلب ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ حلول کر گیا ہے۔ گویا اللہ ہی نے اس کائنات کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر شے اب اللہ کی ذات کا عین بن گئی ہے۔ یہ بھی اپنی نوع کا بدترین شرک ہے۔ پھر ایک اور عقیدہ ''اَوتار'' کا پیدا ہوا، یعنی خدا کسی انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہو جاتا ہے یا کسی انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ اَوتار کا عقیدہ بھی بدترین شرک فی الذات ہے۔



## شرک فی الصفات

آگے چلیے! شرک فی الصفات کا معاملہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، کچھ علمی نوعیت کا ہے، اس لیے کہ ہماری زبان میں الفاظ مشترک ہیں۔ جو الفاظ ہم اللہ کے لیے بطورِ صفت بولتے ہیں وہی مخلوقات کے لیے بھی بولتے ہیں۔ مثلاً اللہ بھی موجود ہے، ہم بھی موجود ہیں۔ اللہ بھی زندہ ہے، ہم بھی زندہ ہیں۔ اللہ بھی سنتا ہے، ہم بھی سنتے ہیں۔ اللہ بھی دیکھتا ہے، ہم بھی دیکھتے ہیں۔ اب اس لفظی اشتراک سے مغالطہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ان صفات کا اطلاق جب اللہ پر ہوتا ہے تو مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور یہی صفات جب مخلوقات کے لیے استعمال ہوں گی تو ان کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔ اس ضمن میں تین چیزیں پیشِ نظر رکھنی ضروری ہیں تاکہ اس معاملے میں مغالطے سے نجات حاصل ہو۔ ایک یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں، جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اس لیے کہ مخلوقات کو اللہ ہی نے وجود بخشا ہے اور صفات بھی عطا کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا وجود بھی لامحدود ہے اور صفات بھی لامحدود ہیں جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی ہستی بھی قدیم ہے حادث نہیں، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ مخلوقات کا ہے، وہ خود بھی حادث ہیں اور ان کی صفات بھی حادث ہیں۔ ان تینوں چیزوں کا فرق اگر سامنے رکھا جائے تو پھر اس میں مغالطہ نہیں ہوگا، لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو جائے تو شرک کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

## شرک فی العبادۃ اور اس کی شاخیں

اب آیئے شرک کی تیسری قسم کی طرف، یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو ساجھی بنا دینا۔ اگر ہم اللہ کے حقوق شمار کریں تو ہم اس کا اِحصاء نہ کر سکیں گے۔ لیکن ایک لفظ ایسا ہے کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق اس میں سب حقوق آ جاتے ہیں، اور وہ لفظ ہے ''عبادت''۔ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لیکن

اس لفظ عبادت کی قدرے تشریح ہوگی تو بات سمجھ میں آئے گی۔ اس ضمن میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ پانچ چیزیں گن کر ذہن نشین کر لیں۔ عبادت میں اہم ترین چیز ہے ''اطاعت''۔ توحید فی الاطاعت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب آجائے۔ بقیہ تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں۔ اگر کسی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے برابر ہوگئی تو یہ شرک فی الاطاعت ہو جائے گا۔ تمام اطاعتیں اللہ کے تابع ہوں تو یہ توحید ہے۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))[1] ''کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوگی اس چیز میں کہ جس میں خالق کی معصیت لازم آ رہی ہو''۔ اللہ کی اطاعت کے تابع والدین کی اطاعت بھی ہے' اساتذہ کی بھی ہے' اولی الامر کی بھی ہے' حکام کی بھی ہے۔ کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ اگر آزاد ہوئی تو شرک فی الاطاعت لازم آجائے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اللہ کی اطاعت جناب محمد رسول اللہﷺ کے واسطے سے ہوگی۔ قرآن مجید بھی ہمیں نبی اکرمﷺ کے توسط سے ملا ہے۔

دوسری چیز ہے ''محبت''۔ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ کوئی محبت اللہ کی محبت کے ہم پلہ نہ ہو۔ ہمارے قلب کے سنگھاسن پر بالاترین محبت اللہ کی براجمان ہو۔ بقیہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ اگر کسی اور کی محبت اللہ کی محبت کے برابر آ کر بیٹھ گئی تو جان لیجیے کہ یہی شرک ہے۔ یہ دو چیزیں ''اطاعت'' اور ''محبت'' بہت اہم ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ وہ اصول ہیں کہ جن کو انسان خود حالات پر منطبق کر سکتا ہے۔ اصول اگر ہاتھ میں آجائیں تو ان کا اطلاق کر کے انسان تمام مسائل حل کر لے گا۔ ایک ضروری بات یہاں پھر نوٹ کر لیجیے کہ اطاعت اور محبت دونوں اعتبارات سے اللہ کے ساتھ اللہ کے رسولﷺ بھی شامل ہیں۔ اللہ کی اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت

(۱) سنن الترمذی، کتاب الجهاد عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔



تمام اطاعتوں پر غالب ہو تو یہ توحید ہے۔ کوئی اور اطاعت ان کے ہم پلہ ہوگئی یا بالاتر ہوگئی اور کوئی محبت ان کے برابر ہوگئی یا بڑھ گئی تو یہ شرک فی الاطاعت اور شرک فی المحبت کی صورت ہوگی۔

تیسری چیز ہے دعا۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ))[1] ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ))[2] ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ چنانچہ دعا اللہ کے سوا کسی سے نہیں کی جائے گی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ﴾ (القصص:۸۸) ''اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو''۔ پکارو اسی کو' مانگو اسی سے۔ یہ ہے توحید فی الدعا۔ اور اگر اللہ سے بھی دعا کر رہے ہو' مانگ رہے ہو اور کسی اور سے بھی تو یہ شرک فی الدعا ہے۔

چوتھی چیز ہے اخلاص۔ اگر متذکرہ بالا تینوں باتوں میں ریاکاری کا کہیں شائبہ ہو گیا تو یہ بھی شرک ہے۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ))[3]

''جس نے دکھلاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھلاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا وہ شرک کر چکا۔''

یہ شرکِ خفی کہلاتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اقبال نے جو کہا ہے کہ ع

''ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!''

تو اس کا اطلاق اسی نوع کے شرک پر ہوتا ہے۔ حضورﷺ نے تجزیہ کر کے بتا دیا کہ اگر ایک شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور اس نے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے' اس لیے سجدہ طویل کر دیا تو اس نے شرکِ خفی کا ارتکاب کیا' چونکہ اس طرح اس کے سجدے کے مسجود

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب منه۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة البقرة۔

(۳) مسند احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث شداد بن أوس۔

دو ہو گئے۔ وہ اللہ کو بھی سجدہ کر رہا ہے اور جسے دکھا رہا ہے گویا اسے بھی سجدہ کر رہا ہے۔معلوم ہوا کہ ریاء وسُمعہ یعنی عبادت دوسروں کو دکھانے یا سنانے کی نیت سے کرنا شرک فی الاخلاص ہے۔

خواہشِ نفس کی بلاقید پیروی بھی شرک ہے۔قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (الفرقان:٤٣)

اور:

﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثیة:٢٣)

''(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا؟''

یہاں لفظ ''الٰہ'' آیا ہے جو ہمارے کلمۂ توحید کے جزوِ اوّل کا لفظ ہے۔معلوم ہوا کہ صرف سامنے رکھی ہوئی مورتیاں ہی نہیں پوجی جاتیں' اندر کی نفسانی خواہشات کو بھی پوجا جاتا ہے۔

باطن کے اصنام میں مال و دولت کی وہ محبت بھی شامل ہے جس کے حصول میں حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جائے۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))(۱)

''ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہو گیا) دینار و درہم کا بندہ''۔

آنحضورﷺ نے لفظ کون سا استعمال فرمایا! عبد۔ اس لیے کہ جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا حرام سے' جائز سے آئے یا ناجائز سے' صحیح راستے سے آئے یا غلط راستے سے' دولت کی اس طمع اور محبت کا مطلب ہے کہ دولت اس کا معبود ہے' چاہے وہ ہندوؤں کی طرح ''لکشمی دیوی'' کو نہ پوج رہا ہو۔شریعت کی قیود و حدود اور شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت کی چاہت بھی شرک ہے۔

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب فی مسند المکثرین۔



اس ضمن میں پانچویں اور آخری چیز یہ ہے کہ کچھ مراسمِ عبودیت ایسے ہیں جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔کسی کو بھی سجدہ نہیں ہو گا سوائے اللہ کے۔ اس معاملے میں شیخ احمد سرہندیؒ کا جو مقام تھا اور ان کی جو عزیمت تھی' اسے علامہ اقبال نے خوب تعبیر کیا ہے: ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔اسی طرح رکوع بھی اللہ کے لیے خاص ہے' اس کے خلاف عمل شرک فی العبادۃ میں شمار ہو گا۔

یہاں موقع کی مناسبت سے شرک کی چند موٹی موٹی اقسام ہی بیان کی جا سکی ہیں' لیکن ان سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شرک کا مسئلہ کتنا ہمہ گیر ہے۔ ہر مسلمان کو شعوری طور پر شرک سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔اس کی تیر بہ ہدف تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر ہمارا یقینِ محکم ہو۔ ہمارا جتنا توکل اور اعتماد اللہ کی ذات اور اس کی ربوبیت پر بڑھے گا اتنا ہی ہم اِن تمام چیزوں سے بچ سکیں گے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اگر ہمیں التزامِ توحید اور اجتنابِ شرک کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ ہماری اُخروی کامیابی اور فوز و فلاح کے لیے کفایت کرے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ OO